پہلا سفر ۔ رَتھ کی سواری ۔ ۱۹۳۴ء

رامپور: رتھ میں دو بیل بھی ہوتے تھے اور ایک بھی۔ سواریوں کے لئے پردے کا نظام تھا۔

ہم نے سفَر کرنا کب سے شروع کیا، جب ہم حافظے پر زور ڈالتے ہیں تو ہمیں یاد آنے لگتی ہیں اتنی ساری باتیں کہ ہر چیز لکھنے بیٹھ جائیں تو ہمیں لکھنے میں اور سب کو پڑھنے میں طوالت ہو گی۔ بہر حال ......

ہمیں یاد رہے گا ذرا ذرا
انہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہمیں اپنی رَسَمِ بسمِ اللہ بھی یاد ہے، روزہ کشائی بھی۔ روزہ ہمیں جلد رکھوا دیا گیا تھا کہ کچھ تو بچپن میں شوق ہوتا تھا اور کچھ گھر والوں کو دیکھ کر ہمّت ہوتی تھی۔ ہم نے اپنا پہلا سفر اِس لئے اس واقعے کو لکھا ہے کہ

گھروں سے فاصلے پر کسی کام پر جانے کو یا شادی وغیرہ کے سِلسلے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کو بھی سفر میں شُمار کرتے تھے۔ سفر کی جو آسانیاں آج ممکن ہیں، اتنی آسانیاں اُس وقت نہیں تھیں۔ اُس وقت بھی سب کو کسی بھی ایک سفر کے لئے ایک ہی جیسی سہولت نہیں تھی۔ آج بھی ہر چیز ہر شخص کے لئے ممکن نہیں ہے۔

ہم نے ہماری اپنی یادداشت کا پہلا سفر ۱۹۳۳ء میں کیا، یا ۱۹۳۴ء میں۔ اس سفر کا ہمارے ذہن میں اب صرف ایک دھندلا سا خاکہ ہے، لیکن رسمِ بسم اللہ اور یومِ روزہ کشائی کی طرح اس سفر کی کچھ خاص خاص چیزیں یاد ہیں۔ ہمیں تو یہ یاد ہے کہ ہم اپنے والِد، والدہ اور بہن کے ساتھ ایک شادی پر رَتھ پر گئے تھے اور دُلہن کے گھر ساری رات رہے تھے۔ رَتھ ایک خاص طرح کی بیل گاڑی ہوتی تھی۔ اس بیل گاڑی میں دو بیل جُتے ہوتے تھے، اور ۲/عدد بیلوں کے جُتے ہونے کا مطلب تھا کہ مسافر یا بیل گاڑی کا مالک صاحبِ حیثیت ہے۔ کچھ رَتھ ایک بیل کے ساتھ بھی ہوتے تھے، خاص طور پر اگر رَتھ میں وزن بھی کم ہو۔ ہم رَتھ میں پہلی مرتبہ بیٹھے تھے۔ اس رَتھ میں ہمارے ساتھ صرف ہماری والدہ اور بڑی بہن تھیں۔ اس کے علاوہ ہم تینوں اور ہمارے والد کا کچھ سامان تھا جو بقچیوں میں بندھا ہوا تھا۔ ہمارے والد رَتھ سے باہر تھے۔ رات کو جاتے وقت ہمیں باہر کا کچھ اندازہ نہ تھا کہ ہم کہاں جارہے تھے اور رَتھ بذاتِ خود کِس طرح کا تھا۔ رَتھ کے خیمے کا پردہ ہٹا کر ہم نے باہر جھانک کر دیکھا تو دیکھا کہ بارات کے ساتھ روشنی کے ہنڈے اور گیس کی لالٹینیں چل رہی تھیں اور کچھ سامان بھی جارہا تھا۔ ہماری والدہ اور ہماری تقریباً ۱۶/سالہ بہن کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس سامان میں دولہا کی طرف سے مٹھائیاں، لڈو، چھوارے، اور سرخ رومال تھے۔ دولہا کی طرف سے یہ چیزیں ان سرخ رومالوں میں باندھ کر نکاح کے بعد بٹنا تھیں۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ اکثر باراتوں میں مٹھائی ایسے ہی ہاتھوں میں دے دی جاتی تھی یا کاغذ کے تھیلوں اور ڈبّوں میں، لیکن یہ بارات کسی صاحبِ حیثیت شخص کی تھی اس لئے سرخ رومال استعمال ہوئے تھے۔ پھر یہ کہ اگر کوئی زیادہ مالدار گھرانہ ہوتا تو رومال کی جگہ بھرت یا چاندی کی رکابیوں میں یہ مٹھائی بانٹی جاتی، اور رکابیوں پر تاریخِ نکاح اور دولہا اور دلہن کا نام بھی کھدا ہوا ہوتا۔ اماں کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ بارات کافی دور کی تھی، کیونکہ قریب کی بارات کے لئے ہم ڈولی میں جاتے اور رَتھ کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس زمانہ میں رامپور اور دوسرے چھوٹے شہروں میں عورتیں ابھی برقعہ پہن کر نہیں نکلتی تھیں، اور ڈولی یا رَتھ کے اوپر بنے ہوئے خیموں میں اندر بیٹھ کر سفر کرتی تھیں۔ ویسے تو برقعہ بھی ایک خیمہ ہی تھا جِسے خواتین خود پہن کر چلتی تھیں لیکن اس سے بیلوں اور کہاروں کی روزی کا نقصان ہوتا تھا۔

دلہن کے گھر پہنچ کر زبردست انتظام نظر آیا۔ شربت، پھل، اور مٹھائیوں سے تواضع ہوئی۔ کھانا تو براتی رسم کے مطابق دولہا کے گھر سے ہی کھا کر چلے تھے۔ رات کو ہم بارات کے ساتھ دلہن کے گھر رُکے تھے، اور اتنا یاد ہے کہ شور شرابے کی وجہ سے کافی رات گئے جاگے تھے۔ دلہن والوں نے مراثنوں کا انتظام کیا تھا جو کافی دیر تک ناچ گانے، شعر و شاعری، اور لطیفوں سے سب کو نوازتی رہیں اور ہم اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رات گئے اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل میں مصروف رہے۔ سب ہی لوگ دیر سے سوئے۔

صبح سب اٹھے تو دلہن والوں نے باراتیوں کو ناشتہ کروایا۔ ابھی ناشتہ ہو ہی رہا تھا کہ معلوم ہوا کہ ہماری ایک ہم عمر رشتہ دار صاحبزادی کے گلے میں رات کو ایک سونے کا بھاری سا ڈھولنا تھا، جو اُن کے صبح جاگنے پر غائب تھا۔ ڈھولنا ایک قیمتی زیور ہوتا ہے، سونے کی ایک موٹی سی زنجیر میں سونے ہی کے ایک ڈھول نما جز و کے ساتھ۔ اب بڑی پریشانی ہوئی۔ سارے رَتھ اور اصحاب روک لئے گئے، اور دروازے پر آدمی بٹھا دیئے گئے اور ہر ایک کی تلاشی شروع کی گئی۔ سب باری باری باہر نکلے، اور نکلتے وقت تلاشی لی گئی، لوگوں کی بھی اور اُن کے ساتھ کی بقچیوں کی بھی۔ ہمیں اس کی تو خبر نہیں کہ ڈھولنا ملا کہ نہیں، لیکن یہ دیکھا کہ دولہا اور دلہن والے باہر کھڑے ہوئے سب سے معافیاں مانگتے پھر رہے تھے کہ مہمانوں کی تلاشی لی گئی تھی۔ پھر بھی سب اتنے پُرتحمل رہے کہ بغیر غصے کے میزبان کی اس تلاشی میں مدد کرتے رہے جیسے کہ آج کے دور میں ہوائی اڈّے پر طیارہ پر سوار ہونے سے پہلے سب مسافر بڑی خوشی خوشی اپنی تلاشی دے رہے ہوتے ہیں۔

غرض کہ خدا خدا کر کے یہ قضیہ ختم ہوا اور سب سوار ہونے کو تیار ہوئے۔ اب دِن کی روشنی میں ہم نے پہلی بار رَتھ کو اچھی طرح دیکھا۔ یہ بھی دیکھا کہ ہمارے رَتھ کے ساتھ ہر طرف رَتھ ہی رَتھ تھے، اور ان کے آگے اِتنے اُونچے اُونچے ناگوری بیل جِن کی پِیٹھ پر سُرخ کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ ان کپڑوں پر کوڑیوں کا کام بنا ہوا تھا۔ بیلوں کے گلے میں گھنگروؤں کے ہار پڑے ہوئے تھے اور سروں پر سفید اور چتکبری جھالر لٹکی ہوئی تھی جو آنکھوں کو ڈھک رہی تھی۔ رتھ کے بیل کے پیچھے بیٹھنے والی گاڑی کو دیکھا تو یہ دو پہیوں کے درمیان لکڑی کا ایک بڑا سا صندوق تھا، جس کے اوپر سواریوں کے بیٹھنے کے لئے آرامدہ جگہ بنی ہوئی تھی اور نیچے صندوق میں سامان رکھا جا رہا تھا، پانی کی مشک تھی، اور کچھ گھاس اور بھوسا رکھا تھا جو غالبًا بیلوں کے لئے تھا۔ سواریوں کے بیٹھنے کا حصہ ایک تخت کی طرح تھا۔ اس تخت کے اوپر نرم لکڑیوں سے بنایا ہوا ایک گنبد یا بُرج

نما پنجرہ سا جوڑا گیا تھا، اوراس پنجرہ کے چاروں طرف بڑا خوبصورت سُرخ اور ہرے رنگ کا کپڑا منڈھا ہوا تھا۔ نیچے کے حصے میں تخت کے قریب پردے لگے تھے تا کہ اگر اندر کی خواتین چاہیں تو پردے کوخفیف سا ہٹا کے باہر جھانک سکیں۔اب یہ رتھ چلے تو دن میں یہ بیل زیادہ جھوم جھوم کے چلتے ہوئے لگے اور ہمارا رتھ اب زیادہ ہل ہل کر چلتا ہوا محسوس ہوا۔گرمی بھی غضب کی ہو رہی تھی۔اُس پرطُرّہ یہ کہ چار سال کی لڑکی بھی پردے کی پابند۔ پردے میں ذرا سی جھری کر کے باہر جھانک نہیں سکتے کہ مرد حضرات ساتھ ساتھ دوسرے رَتھوں میں جا رہے ہیں، کہیں کسی کی نظر نہیں پڑ جائے، اور کہیں ہمارے ابّا نہ دیکھ لیں، کہ عزّت کا معاملہ تھا۔غرض کہ گھر آتے آتے شدید گرمی اور جھولتے ہوئے چلنے میں اتنا لطف ملا اور اتنی ہی تکلیف رہی کہ یہ سفر ہم کو اب تک یاد رہا، ایسے ہی کہ جیسے ہمیں اپنے بچپن کا پہلا روزہ یاد ہے۔

دوسرا سفر ۔ تانگہ اور بائیسکل ۔ ۱۹۳۵ء

تانگہ، بغیر چادر کے۔

یہ باتیں کسی ڈائری میں درج نہ تھیں، بلکہ ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ تھیں۔ وقت کچھ چیزوں کو دھندلا دیتا ہے، لیکن کچھ یادیں مٹائے نہیں مٹتی ہیں۔

یہ بھی غالباً ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ہمارے والد صاحب کے ایک دوست جناب راغب صاحب نے دعوت دی کہ آموں کے موسم میں ہمارے گاؤں آئیں اور فصل کے تازہ آموں کا مزہ چکھیں۔ ہماری والدہ اور ہمیں بھی ساتھ بلایا تھا۔ راغب صاحب متوالی نامی گاؤں میں رہتے تھے۔ ہم کو بھی گھر سے باہر نکلنے کا شوق رہتا تھا، اور ہماری بڑی بہن کو بھی شوق ہوا۔ ہم نے اپنے والد سے کہا کہ ''ببّا یہاں تو ہمیں ضرور جانا ہے''۔ ہم اپنے والد کو ببّا کہتے تھے۔ ہماری بات تو ببّا فوراً مان لیتے تھے لہذا جانے کی منصوبہ بندی کی تکمیل میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ لیکن رامپور سے کافی دور کے ایک گاؤں جانا تھا اور سفر اتنا آسان نہیں تھا

کیونکہ یہ بس پگڈنڈیوں ہی سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔قریب کے سفر میں ڈولیاں کافی تھیں، لیکن اتنی دور جانے کے لئے تانگہ لازمی تھا، اور یہ بھی ضروری تھا کہ تانگہ والا کوچوان بھی پرانا جانا پہچانا ہو کیونکہ راستے میں ہر طرح کی دشواری ممکن تھی، اور کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ کوچوان سے کیا کام لینا پڑ جائے۔آجکل کی سہولتوں سے مقابلہ کریں تو ششدر رہ جاتے ہیں کہ وہ سفر ہم نے کیسے کر لئے تھے۔

سفر کے طے شدہ دن ببّا نے اپنے ایک پرانے کوچوان کو ہمارے گھر آنے کے لئے کہہ دیا۔تانگہ آیا تو ہم نے دیکھا کہ اِس پر چاروں طرف چادروں سے پردہ پڑا تھا۔اماں، باجی اور ہم صبح سے تیار بیٹھے تھے۔اماں اور باجی نے برقعہ پہنا ہوا تھا، اور تانگہ کے اندر بھی یہ برقعہ پہنے رہنا تھا۔

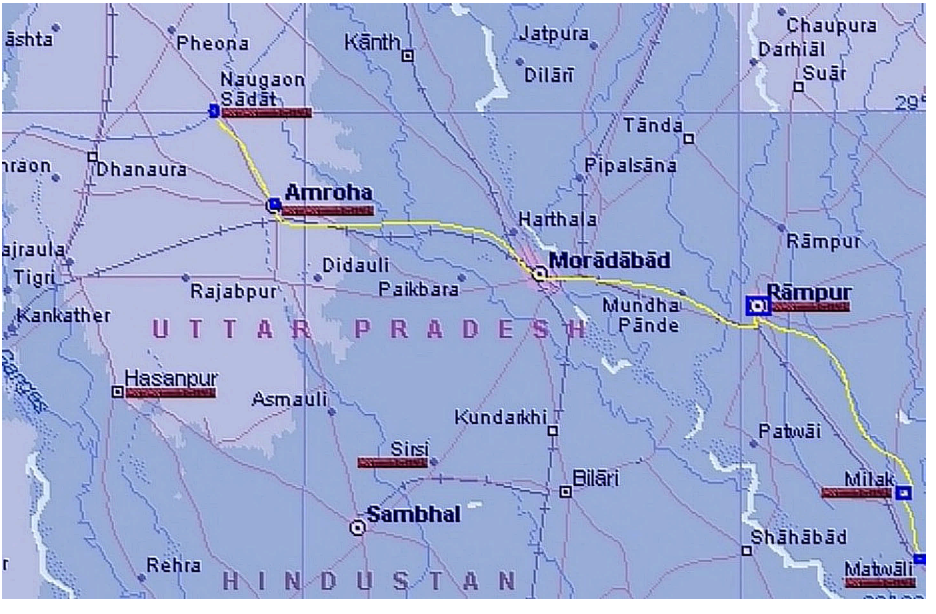

رامپور : تحصیلِ ملک۔ سِرسی ۔ امروہہ ۔ نوگاواں

کوچوان تانگہ کو ڈیوڑھی سے لگا کے اُس کی آمد کا اعلان کر کے ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا اور ہم تینوں تانگہ میں سوار ہو گئے۔کوچوان صاحب گھوڑے کے پیچھے ایک چھوٹی سی گدّی پر بیٹھے تھے۔ ہمارے ببّا ساتھ ہی اپنی بائیسکل پر سفر کر رہے تھے۔ان کے پاس ریلے بائیسکل تھی جو بہت اچھی سمجھی جاتی تھی۔اس کے علاوہ فلپس اور ہرکولیس اس زمانے کی اچھی سائکلیں سمجھی جاتی تھیں۔غرض اِس طرح ہم صبح ہی صبح رفتِ منزل

ہوا کئے۔

جب تک تانگہ شہری علاقہ میں رہا ہم تانگے کے پردے کے اندر ہی رہے۔ جیسے ہی شہر ختم ہوا اور گاؤں در گاؤں آنا شروع ہوئے، ہم نے ببّا سے شکایت کرنا شروع کر دی کہ ہمیں تانگے سے کچھ نظر نہیں آتا اور ہمارے لئے تو بس بائیسکل پر سفر ہی زیادہ مناسب ہوگا۔ ببّا نے تانگہ رکوا دیا۔ ہم تانگے کے باہر آئے اور سفر اب سائیکل پر شروع ہوا۔ اب ہمیں اپنی اماں اور باجی پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے جتنے بھی سفر کئے سب کے سب اسی طرح پردہ نشین دور کی معراج میں، اور انہوں نے غالباً کوئی بھی جگہ زیادہ اچھی طرح نہیں دیکھی ہوگی۔

اب بائیسکل پر بیٹھنے سے سفر کا مزہ ہی تبدیل ہو گیا۔ کہاں تانگہ کے پردہ کے اندر کا حبس، اور کہاں کھلی ہوا میں بائیسکل کا سفر! ہم اسی طرح چھوٹے بڑے گاؤں گزرتے دیکھتے رہے۔ اس سفر کے دوران پہلی دفعہ اپنے ہی تانگے کے گھوڑے کو دیکھا۔ یہ اتنا اونچا گھوڑا، کشمشی رنگ کا چمکدار۔ بڑے اطمینان سے تانگے کو کھینچے لے جا رہا تھا۔ اسی طرح ہم رامپور کی ملک تحصیل پہنچ گئے جہاں ہمارے رشتے کے ایک ماموں اعجاز رہتے تھے۔ یہ بھی سرکاری ملازمت میں تھے۔ ہمارا یہاں پر کچھ آرام کر کے متوالی جانے کا ارادہ تھا، لیکن ذرا ہی سا آرام کر سکے تھے کہ کوچوان نے آوازیں دینا شروع کر دیں کہ رات ہونے والی تھی اور رات کا سفر صحیح نہیں تھا۔ اس پر ہماری والدہ اور باجی دونوں پھر تانگے میں سوار ہو گئیں اور ہم اور ببّا سائیکل پر ساتھ ساتھ روانہ ہوئے، اور ذرا ہی سی دیر میں ہم آبادی پیچھے چھوڑ کر پھر دیہاتی پگڈنڈیوں پر دور گزرتے ہوئے دیہاتوں کو دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دور چل کر پتہ نہیں یہ گھوڑے کو کیا ہوا کہ اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ کوچوان نے شروع میں گھوڑے کو کافی سہلایا اور کوشش کی کہ وہ پیار محبت سے چلنے پر تیار ہو جائے، اور پھر اسے چابک سے مارنا شروع کر دیا۔ اب گھوڑا کبھی دس قدم آگے چلے اور کبھی دس قدم پیچھے، اور کبھی ہنہنا کے پچھلے قدموں پر کھڑا ہو جائے۔ پھر اچانک گھوڑے نے سرپٹ بھاگنا شروع کیا تو پیچھے پیچھے سائیکل پر ببّا اور ہم۔ چند ہی منٹوں میں تانگہ تو ایسا لگا کہ دور درختوں کے درمیان جاتی ہوئی پگڈنڈی میں غائب ہو جائے گا، اور پھر وہ غائب ہو ہی گیا۔ ببّا بھی پیچھے لگے رہے۔ اب ذرا آگے چلے تو دیکھا کہ اماں اور باجی برقعے میں سمٹی ہوئی ایک درخت

کے نیچے بیٹھی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ تانگہ تو جہاں ہو وہاں ہو گا، یہ لوگ تو چلتے تانگے سے چھلانگ لگا کر اتر آئے تھے۔ ببّا نے پوچھا کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی تو اماں نے جواب دیا کہ یہ تو اب متوالی جا کر ہی دیکھیں گے۔ اب ببّا اور ہم دوبارہ تانگے کے پیچھے دوڑے اور کافی آگے جا کر ایک ندی کے پاس تانگہ کھڑا مل گیا۔ کوچوان اور گھوڑا دونوں ہی کھڑے ہانپ رہے تھے۔ کوچوان بڑی ندامت سے کہنے لگا کہ ''صاحب افسوس کہ گھوڑا بے قابو ہو گیا۔ گرمی بھی ہے اور سفر بھی لمبا ہو گیا تھا۔ ابھی یہاں اس نے ندی کے پاس آ کر دم لیا تو میں نے اسے پانی میں کچھ غوطے دیئے ہیں اور اب یہ کچھ ٹھنڈا ہوا ہے''۔ ببّا نے اس سے پوچھا، ''میاں تمہاری سواریاں کہاں ہیں؟''۔ اس نے گھبرا کر کہا، ''صاحب اندر تانگے ہی میں ہونگی''۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے کہ کوچوان کو خواتین کے پردے کا اتنا لحاظ تھا۔ اُس نے خیریت دریافت کرنے کے لئے اندر جھانکنے کے بجائے خاموشی زیادہ مناسب سمجھی۔ ہمارے والد نے جب اُسے بتایا کہ اماں اور باجی تو کافی پہلے ہی تانگہ چھوڑ چکی تھیں تو وہ جیسے شرم سے زمین میں گڑ گیا اور اس سے تو چلنا ہی مشکل ہو گیا۔ ہم واپس آئے، اماں اور باجی کو دوبارہ سوار کیا اور ہم پھر متوالی گاؤں کی طرف چلے جو ندی کو پار کر کے ندی کے دوسرے کِنارے پر کچھ اور چل کر آ گیا تھا۔

جب ہم متوالی میں ببّا کے دوست راغب چچا کے گھر پہنچے تو رات ہو چلی تھی۔ وہ لوگ بہت فکرمند تھے۔ یہ بھی تانگے سے رامپور آتے جاتے رہتے تھے اور یہ راستہ اتنا ہی تھا کہ تانگے سے گرمی کے دنوں میں ہمیں شام سے پہلے ہی پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ انہوں نے سارا واقعہ سنا اور خوشی ظاہر کی کہ سب خیریت سے تھے۔ تانگے کے کوچوان کو رات رکنے اور آرام کے بعد صبح کو جانے کا مشورہ دیا، کیونکہ گھوڑا اور کوچوان، دونوں ہی تھک گئے تھے۔ کوچوان بھی راضی ہو گیا۔

صبح ناشتہ میں گھر کا دودھ، بالائی، لسّی اور آم سے تواضع ہوئی۔ پھر راغب چچا ہم سب کو کھیتوں پر فصل دکھانے لے گئے۔ اس زمانے میں شہروں میں تو عورتوں کو باہر نکلنے کی پردے داریاں تھیں، لیکن گاؤں میں وہاں کی اپنی ضروریات ایسی ہوتی تھیں کہ عورتوں کو خوب باہر آنا جانا پڑتا تھا۔ وہ باہر نکل سکتی تھیں، لیکن کافی گھونگٹ نکال کر یا برقعہ پہن کر۔ ہم سارا دن دوسرے بچوں کے ساتھ باہر کھیل میں مصروف رہے۔ کھانوں میں کڑھی، ساگ، مرغی وغیرہ، یہی سب دیہات کے کھانے تھے اور ان کا مزہ بھی خوب تھا۔ راغب

صاحب زمیندار آدمی تھے۔ ان کا گھر بہت بڑا تھا اور دریا کے کنارے تھا۔ سیلاب سے بچاؤ کے لئے یہ کافی اونچائی پر تھا۔ ہمیں وہاں دو یا تین ہی دن ہوئے ہوں گے کہ وہاں موسم برسات کی طوفانی بارشوں نے آلیا اور سات یا آٹھ روز تک بارشیں ہوتی رہیں۔ بارش بھی ایسی کے یہ ذرا سی ندی یا نہر سمندر لگنے لگی۔ نیچے کے علاقے میں کسانوں کے گھر میں تو پانی ضرور آ گیا ہوگا۔ ہم بھی ساری رات جاگتے رہتے اور ہر طرف مٹّی کے تیل کی لالٹینیں روشن رہتیں۔ بارش ختم ہونے کے دو یا تین دن بعد پانی اترا اور پھر ببّا نے اجازت مانگی کہ اب چلنا ضروری تھا۔

راغب چچا نے اپنے ملازمین کو دو بیل گاڑیاں تیار کرنے کی ہدایت کی۔ ایک بیل گاڑی میں ہم مہمان، اور دوسرے میں میزبان، جو ہمیں واپس چھوڑنے چل رہے تھے۔ انہی بیل گاڑیوں میں بیٹھ کر ندی پار کی جو اب بھی دریا لگ رہی تھی۔ ندی پار کرنے کے بعد ہمیں ایسی جگہ ملی جہاں سے تانگے حاصل کئے جا سکتے تھے۔ اللہ کی مہربانی تھی کہ ایک تانگہ فوراً ہی مل گیا اور وہ جانے پر راضی بھی ہوگیا۔ اس تانگے میں سوار ہو کر ہم تو سو گئے اور سارے راستے آدھے سوتے اور آدھے جاگتے، شام تک رامپور پہنچ گئے۔ اب اتنا تھک چکے تھے کہ فوراً ہی سو گئے اور دوسرے دن ہی آنکھ کھلی۔

اب پورے ہندوستان میں تو اُس وقت بھی ایسے سفر نہیں ہوتے ہوں گے کیونکہ ریل گاڑیاں ہر جگہ پہنچ چکی تھیں یا پہنچ رہی تھیں۔ ۱۹۳۴ء میں بسیں بھی اکّا دکّا نظر آنے لگی تھیں۔ خود ہمارے ہونے والے دولہا بھائی سید اعجاز حسین ضامنؔ کے بھائی محمد عاقل کی رائے بریلی میں لاریاں چلتی تھیں۔ لیکن ہم نے اِس سفر میں ایسی جگہ کی بات لکھی ہے جو گذشتہ ستر سال میں بھی شاید اتنی زیادہ نہ بدلی ہو۔ کچھ ہی دنوں پہلے ہندوستان کے بارے میں ایک امریکی ٹیلی ویژن کی فلم سے لگتا ہے کہ یہ لوگ ابھی بھی وہاں بیل گاڑیوں ہی میں سفر کرتے ہیں۔

تیسرا سفر ۔ ہاتھی کی سواری ۔ ۱۹۳۵ء

اب آپ کو ایک اور بارات کا ذکر سناتے ہیں۔ اس کا بھی اس زمانے کے رسَم و رواج اور سہولیاتِ سفر سے تعلق ہے۔ ہاتھی پر بیٹھنے کا ہر بچّے کو شوق تھا، سو ہمیں بھی تھا، مگر راَم پور جیسی جگہ پر کسی خاص موقعہ کے علاوہ ہاتھی پر سفر کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ یہ کافی گنجان آبادی تھی۔

ہمیں ہاتھی پر سواری کا پہلا موقعہ اپنے ایک عزیز کی بارات پر ملا۔ ان کے رشتہ داروں نے ہمیں بچّہ سمجھ کر ہاتھی پر بیٹھنے کی دعوت دی اور ہمارے والد نے نامعلوم کیا سوچتے ہوئے ہمیں اجازت دے دی۔ رامپور کی رسم تھی، جو غالباً اُس زمانے میں اس پورے علاقے ہی کی رسم تھی کہ وہاں گلیوں میں بچے اور کچھ بڑے حضرات بھی جھولیوں میں چھوٹے چھوٹے کنکر اور پتّھر جمع کر کے کھڑے رہتے اور جب بارات گزرتی تو وہ لوگ یہ کنکر اور چھوٹے پتھر دولہا کو مارتے۔ اس رسم کے مطابق ہم نے اکثر اپنے گھر کے سامنے گزرتی ہوئی باراتوں کا حشر ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہمارے والد اس رسم کا پسِ منظر کچھ اس طرح بیان کرتے تھے کہ چونکہ

دولہا ان کے محلّے کی لڑکی یعنی دلہن کو اٹھانے یا لے جانے کے لئے آ رہا ہوتا تھا، لہذا دلہن کے دفاع میں کنکر مارنا فرض تھا۔ ہم اس جواب سے مطمئن تو نہ تھے، لیکن رسم یہی تھی اور ہم دولہا کی شامت سے محظوظ ہوتے تھے۔ اب اس بارات میں ہم ہاتھی پر بیٹھے اور ہاتھی چلنے لگا۔ ہم ہاتھی کے اوپر بیٹھے نیچے زمین کو دیکھ رہے تھے تو وہ اتنی دور لگ رہی تھی۔ ہمیں خیال ستانے لگا کہ ہم واپس کیسے اتریں گے۔ ہم اسی سوچ میں گھرے تھے کہ سب لوگوں نے چھتریاں نکال کے باہر رکھ لیں جبکہ نہ بارش کا امکان تھا، اور نہ ہی دھوپ سے بچت کا ایسا کوئی معاملہ تھا۔ ہمیں بھی ایک چھتری دی گئی تا کہ ہم اس کو کھول کر ڈھال بنا سکیں۔ ہم چھتری لے کر بڑے اہتمام سے بیٹھ گئے پتھروں سے دفاع کرنے کے لئے۔ ہم بڑے خوش تھے اس انتظام سے لیکن اتفاق سے وہ بارات کسی بڑے بازار اور مصروف علاقہ سے نہیں گزری اور کوئی خاص پتھر بازی نہیں ہوئی جس سے ہمیں کچھ خوشی بھی ہوئی اور کچھ مایوسی بھی۔

اس تجربہ کے بعد ہم کافی پرُ اعتماد ہو گئے اور خود کو اس قابل سمجھنے لگے کہ ہم ہاتھی پر سامنے بیٹھ سکتے ہیں اور کسی بارات میں پتھر بازی سے دفاع بھی کر سکتے ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ہمارے ماموں جان کی شادی ہوئی جس کا انتظام ہمارے والد کو دیا گیا۔ رامپور میں سرکاری ہاتھی خانہ تھا اور اوپر کے عہدے دار نواب سے درخواست کر کے ہاتھی مانگ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح گھوڑا گاڑیاں، چھ اور چار گھوڑوں والی سواریاں بھی لی جا سکتی تھیں۔ ہم نے ماموں سے پوچھا کہ کیا ان کی بارات بھی ہاتھی پر جائے گی تو انہوں نے ہمیں ہمارے والد سے پتہ کرنے کو کہا۔ اب ہم نے اپنے والد سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ بارات ہاتھی ہی پر جا رہی تھی، اور یہ بھی کہ ہمارے لئے ہاتھی پر بیٹھنے کا انتظام بھی تھا۔ ہم بڑے خوش۔ بارات رات کو جانا تھی۔ رات کو ہم آرام سے دلہن کے گھر گئے اور پتھر بازی تو کچھ نہ ہوئی۔ واپس آتے ہوئے دِن تھا اور ہاتھی پر ہم اپنے دیگر ماموؤں اور خالاؤں کے بچّوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ تھوڑا ہی چلے تھے کہ لیجئے، شامت آ گئی! اینٹ پتھر بازی شروع ہو گئی اور ایک پتھر ہمیں لگ گیا۔ بس ہم نے شور مچایا کہ ہاتھی بٹھاؤ ہم اُتریں گے! ہم اپنے گھر میں بڑے لاڈلے تھے۔ ماموں بھی ہاتھی بان کے سَر ہوئے کہ میاں کہیں روکو تو بچی کو اتار دیں۔ ہاتھی بٹھایا گیا اور دلہن کی پالکی کو رکوا کے ہمیں اس میں بٹھا دیا گیا۔ پتھر مارنے والے بھی شرمندہ ہو کے رفو چکر ہو گئے۔ اب ہم پالکی کا پردہ کھول کر غڑَپ سے اندر بٹھائے گئے ہی تھے کہ اندر سے آواز آئی، ''ہائے، تین سواریاں ہو گئیں دلہن کے ساتھ، یہ اچھا نہیں''۔ لیکن ہم اترنے والوں میں سے نہیں تھے کیونکہ ہمارے لئے تو پالکی ہی بہتر تھی۔ پھر انہی

صاحبہ نے فرمایا کہ،'' تین نہیں، چار ہوں''۔ پھر پالکی زمین پر رکھی گئی اور ایک اور بچے کو اندر بٹھایا گیا جو قطعی پالکی کے اندر بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔ پھر بارات کی دوبارہ گھر کی طرف روانگی ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد ہم نے کبھی ہاتھی پر بیٹھنے کی ضدِ نہیں کی، اور صرف ایک اور بارات میں ہاتھی پر گئے جس میں زیادہ پتھر بازی نہیں ہوئی تھی۔ اس دفعہ ہم نے اپنی چھتری کو خوب مستعدی سے استعمال کیا اور چوٹ سے بچے رہے۔

چوتھا سفر ۔ بیل گاڑی ۔ ۱۹۳۶ء

نوگاواں: یہ بیل گاڑی عموماً ایسے ہی استعمال ہوتی تھی، گو کبھی نرم بانس لگا کر ایک چادر سے پردہ بھی کر دیتے تھے۔

ہماری بڑی بہن کی شادی ۱۱ر نومبر ۱۹۳۵ء کو سادات نوگاواں کے سیّد اِعجاز حسین ضامنؔ صاحب سے ہوئی تھی۔نوگاواں میں سیدوں کی بہت بڑی آبادی تھی، اور یہ سیدان عابدی پشت سے تھے۔ یہ اسی طرح تھا جس طرح امروہہ میں اکثریت نقوی سیدوں کی تھی۔ بہن سے شادی کے بعد ضامنؔ صاحب کو ہم دولہا بھائی کہنے لگے۔شادی کے چند ماہ بعد دولہا بھائی نے باجی کو اپنے عزیزوں سے ملانے کے لئے نوگاواں لے جانے کا پروگرام بنایا۔ ہمارے گھر میں بہت کم اَفراد تھے۔ ہم، ہماری بہن، والِد، والدہ اور ایک سگے چچا تھے۔والدین ضامنؔ صاحب کے بھی نہیں تھے،صرف چچازاد، پھوپی زاد بہن بھائی وغیرہ تھے۔نئی نئی شادی تھی اور ہماری بہن بھی ہمارے بغیر نہیں رہ سکتیں تھیں۔غرض یہ طے ہوا کہ دلہن کی بہن بھی ساتھ جائیں گی۔رامپور سے نوگاواں جانے کے لئے پہلے رامپور سے مرادآباد کے لئے ٹرین لی، اور مرادآباد سے ٹرین بدلی تو اَمروہہ

کے اسٹیشن پر اترے۔ اَمروہہ سے بیل گاڑی میں بیٹھے۔ یہ بیل گاڑی صحیح معنوں میں دیہاتی بیل گاڑی تھی۔ اِس پر نہ چھت تھی اور نہ پردہ۔ بس منہ پر چادر ڈالیں اور بیٹھ جائیں۔ ہم خوش تھے۔ یہ کافی لمبا سفر تھا اور سڑکیں ناہموار، جگہ جگہ تالاب جیسے گڑھے۔ ہلتی اُچھلتی بیل گاڑی پانیوں کو عبوُر کرتی ہوئی بڑھتی رہی۔ کبھی پانی گاڑی کے اندر آ کر سب کو بھگو کے رکھ دیتا۔ اِسی اُچھل کود میں شام ہوئی اور اُن کے گھر تک پہنچے۔ بڑی آوَ بھگت ہوئی۔ وہاں پہنچے تو ایسی آوازیں دی گئیں کہ ''ائے نبوا، ائے سجوا، دیکھو جزوا آ گیا!''۔ ہم سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ دیکھیں ''جزوا'' ہونے کی ذمّہ داری پہلے کون قبول کرتا ہے۔ آخر دولہا بھائی نے وضاحت کی، بولے، ''آپ پریشان نہ ہوں، اِس خاکسار اعجاز کو جزوا پیار میں پکّارا جارہا ہے''۔

اِس 'جزوا' کے بِگاڑے ہوئے نام پر کچھ لکھتے چلیں کہ ہر زمانے میں لوگ نمعلوم کیوں بچوں کے نام پیار میں بِگاڑ کے پکارتے ہیں۔ ایسا ہی ایک قصّہ ضامنؔ صاحب کے بیٹے اور ہمارے بھانجے کی شادی پر ہوا تھا۔ شادی کارڈ پر ان صاحبزادے کا اصلی نام سیّد اِقبال حسُین عابدی، پسر سیّد اِعجاز حسین ضامنؔ عابدی لکھا گیا۔ اب لوگ آ کے پوچھیں کہ یہ ضامنؔ صاحب کا کونسا بیٹا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہم سب اِن بھانجے صاحب کو بچپن میں ''پُھد کے'' کہتے تھے کہ بہت ہی زیادہ توانائی سے بھرپور تھے۔ یہ اب ساٹھ سال کی عمر میں بھی اپنے دوستوں میں ''پُھد کے بھائی'' کہلاتے ہیں۔ غرض یہ کہ شادی کے دعوت نامہ پر نام کے ساتھ ''عرف پُھد کے بھائی'' چھپا، تاکہ لوگ پہچان کر آئیں ورنہ کتنے لوگ نہ آتے۔ اِسی طرح جب ہمارے شوہر کا اِنتقال ہوا تو اخبار کے اشتہار میں پورا نام معہ عہدہ چھپوایا گیا، مگر اُن کے اَمروہہ کے عزیز ہمارے شوہر کو جگّن کے نام سے جانتے تھے۔ انہیں وقت پر خبر نہ ہو سکی اور ایسے لوگ سوئم تک بھی نہیں آئے۔ بہر حال بچپن میں ایک ہی صحیح نام سے بچوں کو پکارنا اچھا رہتا ہے، اور اب ہماری تیسری نسل میں ہر ایک کے پکارنے کا نام اس کا اصلی نام ہی ہے۔

نوگاواں میں یہ دیہات کے بےفکِرے لوگ اپنے کاموں میں مصروف، پُرعزمی سے کام کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ حالانکہ ہماری عمر ایسی نہیں تھی کہ گہرائی تک پہنچتے، لیکن ان کی محنت ہمیں محسوس ہوئی اور نظر آئی۔ دیہات کی سادہ زندگی کا مزہ الگ ہی ہے۔ تازہ تازہ، دھُلی دھُلی سی سبزی، ہر طرف لہلہاتے کھیت، دِل کے اندر کی خوشی چہروں سے پھوٹتی تھی۔

ہمیں اس پورے علاقے سے صرف ایک ''جنات کا کنواں'' یاد رہا۔ یہ نوگاواں کے جنگل میں باؤلی کی طرح کا ایک کنواں تھا اس کا منہ بہت چھوٹا سا تھا۔ منہ کے اوپر ایک منڈیر تھی، اور اوپر سے بھی نیچے کا پانی صاف نظر آتا تھا۔ دیکھنے میں یہ کنواں لگتا تھا، لیکن اس میں غور سے دیکھیئے تو اندر اترنے کے لئے اندرونی دیوار کے ساتھ گول گھومتی ہوئی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے نیچے جائیں، یہ کنواں وسیع ہوتا گیا تھا۔ آخری سیڑھی کے پاس جا کر ایسا انتظام تھا کہ کافی لوگ یہاں چُھپ سکتے تھے۔ نوگاواں بذاتِ خود تو کوئی تاریخی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ لیکن یہ علاقہ صدیوں سے میدانِ جنگ رہا تھا۔ یہاں کے عوام نے ہندوستان پر حملہ کرنے والی ہر فوج کے مظالم سہے تھے۔ انہی حملوں میں ایک حملہ اس قدر سخت تھا کہ حملہ آوروں نے جو گاؤں والا نظر آیا، اسے مار دیا۔ کچھ لوگ کھیتوں میں کھڑی فصلوں میں چھپ گئے تھے تو ان فصلوں کو آگ لگا کر انہیں بھی جلا دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صرف وہ لوگ زندہ بچے تھے جو اس کنویں میں چھپ گئے تھے۔ کنویں کی حالت اس وقت بھی اچھی ہی تھی۔

ہمیں اس سفر کے کئی سالوں بعد خبر ہوئی کہ نوگاواں کے قریب، امروہہ اور نوگاواں کی درمیانی سڑک سے ایک اور سڑک نکلتی ہے جو ایک شہر جوگی پورہ جاتی ہے۔ یہاں ایک درگاہ ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں حضرت علیؑ کی سواری آتی ہے۔ جب آس پاس کے علاقوں کے لوگ کسی مریض کے علاج سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اس مریض کو یہاں لا کر درگاہ کے ایک ستون سے باندھ دیتے ہیں۔ دن و رات تلاوتِ قرانِ پاک اور دعا درود کرتے ہیں۔ شبِ جمعہ کو مجاور کی اجازت کے بعد مریض کو درگاہ کے دروازے پر لایا جاتا ہے۔ اس رات یہاں ایک شیر آتا ہے، اور مزار کو اپنی دُم سے جھاڑ و دیتا ہے۔ یہ شیر صبح تک سر جھکائے یہاں بیٹھا رہتا ہے۔ سنا ہے کہ اسی جمعہ کو مریض شفایاب ہو کر جانے لگتے ہیں۔ اب آگے خدا جانتا ہے۔ ہمارے والدین اور بہن یہاں جا چکے ہیں لیکن ہم نہ جا سکے۔

ہم نوگاواں میں قریب قریب ایک ہفتے رہے، اور واپسی پر پھر بیل گاڑی کی سواری سے امروہہ تک آئے۔